مولانا فراہیؒ کی تفسیر سورۂ فیل

ایک جائزہ

از جناب محمد رضی الاسلام صاحب ندوی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۱)

مولانا حمید الدین فراہیؒ عہد حاضر کے ان ممتاز علماء میں سے ہیں جنھوں نے قرآن اور علوم قرآن پر عظیم الشان کام انجام دیا ہے اور تدبر قرآن کا نیا راستہ نکالا ہے۔ علوم قرآنی سے متعلق ان کے رسالے اور تفسیر نظام القرآن کے مختلف اجزاء شائع ہو کر قبول عام حاصل کر چکے ہیں۔ اس امتیازی خصوصیت کے باوجود ان کی تحریروں میں بعض خیالات ایسے ملتے ہیں جو قرآن کے طالب علم کو کھٹکتے ہیں، اس لئے کہ ان کے سلسلے میں وہ امت مسلمہ کی پوری تاریخ میں منفرد ہیں۔ انھیں میں ایک وہ رائے بھی ہے جس کا اظہار انھوں نے تفسیر سورۂ فیل میں کیا ہے۔ وہ یہ کہ لشکر ابرہہ کا مقابلہ اہل مکہ نے کیا تھا اور پرندے ان پر سنگباری کرنے نہیں بلکہ ان کی لاشوں کو کھانے کے لئے آئے تھے۔ اگرچہ ان کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحی نے بھی اپنی تفسیر "تدبر قرآن" میں بعینہ یہی خیالات اختصار کے ساتھ بیان کئے ہیں لیکن علماء و مفسرین کے درمیان اس نظریہ کو مقبولیت

حاصل نہ ہو سکی۔ چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی ؒ نے ارض القرآن[1] میں اصحاب الفیل پر بحث کرتے ہوئے مشہور و عام روایت ذکر کرنے کے بعد اس نظریہ کا سرسری تذکرہ کر دیا ہے۔ مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی[2] اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ؒ نے اس پر متعدد اعتراضات کئے ہیں اور دلائل کے ساتھ اس کی غلطی واضح کی ہے۔ مولانا ظہیر احمد صاحب اظہر میرٹھی مدرس جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ نے بھی اپنے ایک مضمون "تفسیر سورۂ فیل" (شائع شدہ ماہنامہ الرشاد اکتوبر نومبر ۱۹۸۵ء) میں جو ان کی زیر تالیف تفسیر مفتاح القرآن کا حصہ ہے۔ اس پر اعتراضات کئے ہیں۔ خیال تھا کہ ان بحثوں کے نتیجے میں مذکورہ رائے کی غلطی واضح ہو گئی ہے لیکن سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ کے شمارہ اپریل تا جون ۱۹۸۷ء میں جناب نسیم ظہیر اصلاحی کا ایک مضمون نظر سے گزرا جس میں مولانا میرٹھی کے اعتراضات کا جائزہ لیا گیا ہے اور مولانا فراہی کی رائے کی تائید کی گئی ہے۔ ان کا جائزہ جیسا کچھ ہے اس پر بحث مقالہ میں آئے گی۔ لیکن چونکہ ان تمام مناقشات و مباحثات کی بنیاد مولانا فراہی کی تفسیر سورۂ فیل ہے اس لئے ہم براہ راست اسی کا جائزہ لیں گے اور اس کے ساتھ ہی مولانا امین احسن اصلاحی اور جناب نسیم ظہیر اصلاحی کے استدلالات پر بھی گفتگو کریں گے۔

مولانا فراہی کا طریقۂ تفسیر:

مولانا فراہی کے نزدیک بنیادی ماخذ صرف قرآن ہے۔ حدیث کو فرع کی حیثیت حاصل ہے اس لئے ان کے نزدیک تفسیر کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے قرآن میں

---

[1] ارض القرآن اول ص ۳۱۵ دار المصنفین اعظم گڑھ طبع چہارم ۱۹۵۵ء

[2] قصص القرآن سوم بحث اصحاب الفیل ندوۃ المصنفین دہلی۔

تدبر کیا جائے اور قرآن کے الفاظ سیاق وسباق اور نظم سے اس کا مفہوم سمجھا جائے پھر جو مفہوم سمجھ میں آیا ہو اس پر حدیث کو پرکھا جائے۔ اگر حدیث سے بھی وہ مفہوم معلوم ہوتا ہو تو حدیث کو قبول کر لیا جائے ورنہ وہ مفہوم اختیار کر لیا جائے اور حدیث کے معاملہ میں توقف اختیار کیا جائے:

”شان نزول خود قرآن کے اندر سے اخذ کرنی چاہیے اور احادیث و روایات کے ذخیرہ میں سے صرف وہ چیزیں لینی چاہئیں جو نظم قرآن کی تائید کریں نہ کہ اس کے تمام نظام کو درہم برہم کریں، پھر سب سے زیادہ لائق اہتمام وہ شان نزول ہے جو نظم قرآن سے مترشح ہو رہی ہو۔“ [1]

یہی طریقہ انھوں نے تفسیر سورۂ فیل میں بھی اپنایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

”مفسرین عموماً قصہ کی تمام تفصیلات روایات سے اخذ کرتے ہیں اور ضعیف وقوی روایات میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ یہ شکل مفسر کو صحیح تاویل تک پہنچنے سے مانع ہوتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ واقعہ کی اصلی شکل روایات سے بالکل الگ کر کے دیکھی جائے۔ اس کے بعد روایات پر نظر ڈالی جائے اور کمزور روایات کو صحیح روایات سے چھانٹ کر الگ کیا جائے۔“ [2]

قرآن میں تدبر ضروری ہے لیکن روایات کو پس پشت ڈال کر صرف عقل کا

---

[1] مقدمہ نظام القرآن از مولانا حمید الدین فراہی ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی ص ۲۶-۲۷ طبع اول دائرہ حمیدیہ سرائے میر۔ اعظم گڑھ۔

[2] تفسیر سورۂ فیل ص ۲۳۔

سہارا لینا اور روایات کو عقلی طور پر سمجھ میں آنے والے مفہوم پہ پرکھنا بھی حد اعتدال سے تجاوز ہے۔ ایک تاریخی واقعہ کے بیان کرنے میں روایات ربط یا بس شامل ہو سکتی ہیں اور کچھ مبالغہ آرائی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے پوری روایت کو بے بنیاد اور خود ساختہ قرار دینا صحیح نہیں۔

مشہور عام روایات پر شبہات:

۱۔ روایت کی سند کے بارے میں مولانا فراہی نے لکھا ہے:

> "جو حالات و واقعات بیان کئے گئے ہیں سب یک قلم بے بنیاد ہیں۔ از روئے سند ان میں سے ایک روایت بھی قابل اعتماد نہیں ہے۔ یہ تمام روایات ابن اسحاق پر ختم ہوتی ہیں اور اہل فن کے نزدیک یہ امر طے شدہ ہے کہ وہ یہود اور غیر ثقہ راویوں سے روایت کرتے ہیں۔"[۱]

نسیم اصلاحی صاحب نے بھی ابن حجر کی تہذیب التہذیب سے بہت سے اقوال نقل کئے ہیں جیسے امام مالک کا قول "محمد بن اسحاق دجال ہے" امام بخاری کا قول "محمد بن اسحاق ایک ہزار حدیثوں میں منفرد ہے" ابن نمیر کا قول "وہ مجہول لوگوں سے بے بنیاد روایت نقل کرتے ہیں" احمد بن حنبل کا قول "محمد بن اسحاق تدلیس کرتے ہیں" وغیرہ۔ پھر حاشیہ میں لکھا ہے کہ "امام بخاری اور دوسرے ائمہ حدیث انھیں بالکل ناقابل اعتماد سمجھتے ہیں"[۲] لیکن ان تمام اقوال کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے امام مالک کے قول کا ایک خاص پس منظر ہے۔ مدینہ میں ابن اسحاق سے بڑھ کر

۱ؔ ایضاً ص۴۵

۲ؔ سہ ماہی تحقیقات اسلامی شمارہ اپریل تا جون ۸۷ء صفحہ ۶۲-۶۳

علم الانساب جاننے والا کوئی نہ تھا۔ ابن اسحاق کا خیال تھا کہ امام مالک ذی اصبح کے آزاد کردہ غلاموں میں سے ہیں جبکہ امام مالک اپنے آپ کو حمیر کی شاخ اصبح میں سے سمجھتے تھے اسی وجہ سے دونوں میں منافرت تھی۔ جب امام مالک نے موطا تصنیف کی تو ابن اسحاق نے کہا: "أیتونی به فأنا بیطاره" (اسے میرے پاس لاؤ، اس کا ناقد تو میں ہوں) یہ بات امام مالک کو معلوم ہوئی تو انھوں نے فرمایا: "هذا دجال من الدجاجلة، یروی عن الیهود (یہ دجالوں میں سے ایک دجال ہے، یہودیوں سے روایات نقل کرتا ہے)

"امام مالک حدیث کی وجہ سے ابن اسحاق پر عیب نہیں لگاتے تھے بلکہ اس لیے ان کا انکار کرتے تھے کہ وہ غزوات نبوی سے متعلق یہودیوں کی ان اولادوں کی روایات نقل کرتے تھے جو مسلمان ہو چکے تھے، اور جنھیں خیبر، قریظہ اور نضیر کی جنگوں کے حالات اور اپنے آباء و اجداد کے متعلق اس طرح کے عجیب و غریب واقعات یاد تھے۔ ابن اسحاق یہ روایات معلوم کرنے کے لیے ان کا تتبع کرتے تھے، اور (مرویات کا التزام نہ کرتے) تھے کہ وہ قابل اعتماد بھی ہیں۔"[1]

ان پر ایک بڑا اعتراض تدلیس کا بھی ہے۔ لیکن کسی کا مدلس ہونا اس کی تضعیف کے لیے کافی نہیں ہے۔ خود امام احمد بن حنبل نے تدلیس کے باوجود عروہ کی روایات قبول کی ہیں۔ دراصل "یہ اسلوب اس فرق سے متعلق ہے جو حدیث اور تاریخ کے درمیان موجود ہے۔ حدیث میں مربوط قصہ مطلوب نہیں ہوتا

---

[1] نقوش رسول نمبر لاہور جلد ۱۱ مقدمہ بر سیرت ابن اسحاق از ڈاکٹر محمد حمید اللہ صفحہ ۳۸۔

بلکہ بیان کردہ واقعات کی معرفت کے بارے میں ہر گواہ کی گواہی مطلوب ہوتی ہے جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے اس کا انحصار تو حدیث پر ہے لیکن اس کی غرض یہ ہے کہ تاریخی حوادث کے متعلق ایک مکمل اور مربوط قصہ کے طور پر خبر بہم پہنچائی جائے بغیر اس کے کہ کلام کو اسانید اور بیانات کے تکرار سے بوجھل کیا جائے۔[۱]

ابن اسحاق کو مطعون کرنے والوں سے کہیں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جنھوں نے توثیق کی ہے۔ شعبہ، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، یحییٰ بن سعید، حماد بن زید، حماد بن سلمہ جیسے عظیم محدثین نے ان سے روایت کی ہے۔[۲] بخاری نے صحیح کے علاوہ دوسری کتابوں میں ان سے روایت لی ہے۔ مسلم نے بھی روایت لی ہے اور ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں بھی ان کی روایات موجود ہیں۔[۳] جس شخص کو متعدد ائمہ حدیث نے ثقہ قرار دیا ہو اور جس کی روایات (صحیح بخاری کے علاوہ) صحاح تک میں موجود ہیں۔ اس کی روایت کو محض چند لوگوں کی تضعیف کی وجہ سے (وہ بھی ایک مخصوص پس منظر میں) ناقابل اعتبار قرار دینا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اگر یوں ہی ہم ایک دو اقوال کی روشنی میں راویوں کو مطعون اور ناقابل اعتبار قرار دینا شروع کر دیں تو امام ابو حنیفہ اور امام شافعی جیسے بزرگ فقہاء بھی اس کی زد میں آنے سے نہ بچ سکیں گے اس لئے کہ متعدد لوگوں نے ان پر بھی نقد و طعن کیا ہے۔ اس سلسلہ میں عصر حاضر کے مشہور محقق علامہ شبلی نعمانی کی رائے ملاحظہ ہو:

---

۱ ایضاً ص ۲۸۵۔

۲ ایضاً ص ۲۸۶ بحوالہ جماعیلی: الکمال فی معرفۃ الرجال، مخطوطہ برلن

۳ مقدمہ بر سیرت ابن ہشام از محققین، دار احیاء التراث العربی، لبنان ص ۴۲

"محمد بن اسحاق تابعی ہیں۔ ایک صحابی حضرت انسؓ کو دیکھا تھا۔
علم حدیث میں کمال تھا۔۔۔۔ ان کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کی نسبت۔
محدثین میں اختلاف ہے۔ امام مالک ان کے سخت مخالف ہیں۔
لیکن محدثین کا عام فیصلہ یہ ہے کہ مغازی اور سیر میں ان کی روایتیں
استناد کے قابل ہیں۔ امام بخاری نے صحیح بخاری میں ان سے روایت
نہیں لی لیکن جزء القراءۃ میں ان سے روایت لی ہے۔ تاریخ میں
تو اکثر واقعات ان ہی سے لئے ہیں۔ ابن حبان نے کتاب الثقات
میں لکھا ہے کہ محدثین کو محمد بن اسحاق کی کتاب پر اعتراض تھا
تو یہ تھا کہ خیبر وغیرہ کے واقعات وہ ان یہودیوں سے دریافت کر کے
داخل کتاب کرتے تھے جو مسلمان ہوگئے تھے اور چونکہ یہ واقعات
انھوں نے یہودیوں سے سنے ہوں گے اس لئے ان پر پورا اعتماد
نہیں ہوسکتا۔"[1]

یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ یہ روایت صرف محمد بن اسحاق کے واسطے سے مروی ہے اس لئے کہ روایت کے بعض اجزاء دوسرے راویوں جیسے قتادہ، علیہ بن تمر، ابن عباس اور سعید بن جبیر وغیرہ سے بھی مروی ہیں اور ان میں چڑیوں کے بصراحت سنگباری کرنے کا بھی تذکرہ ہے۔

عجیب بات تو یہ ہے کہ ایک طرف مولانا فراہی روایت کو محض ابن اسحاق کی وجہ سے ناقابل اعتبار قرار دیتے ہیں دوسری طرف خود اس روایت میں موجود اشعار پر اپنے استدلال کی بنیاد رکھتے ہیں۔ حالانکہ ابن اسحاق کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ

---

[1] سیرت النبی اول ص ۲۳-۲۴، دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۸۳ء

انھیں اشعار گڑھ کر پیش کئے جاتے تھے۔

ب۔ مولانا فراہی کے واقعۂ فیل کے سلسلے میں مشہور عام روایت پر مختلف عقلی شبہات عائد کرکے اسے "بے بنیاد، لغو اور غلط" قرار دیا ہے۔ ذیل میں ان شبہات کا جائزہ لیا جائے گا۔

(۱) پہلا شبہہ یہ ہے کہ "روایت میں ہے کہ قریش کے سردار عبدالمطلب خدا کے گھر کی حفاظت کے لئے مقابلہ آرائی کے بجائے پہاڑوں میں جا چھپے۔ حالانکہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جو بغیر مدافعت کے اپنا معبد دشمنوں کے حوالے کرکے پہاڑوں میں جا چھپے۔"

(۲) دوسرا شبہہ یہ ہے کہ "روایت میں ہے کہ عبدالمطلب ابرہہ سے ملنے گئے تو وہ بڑے اخلاق سے پیش آیا۔ اس سے پوری امید بندھتی ہے کہ اگر وہ اس سے خانہ کعبہ کے بارے میں کوئی خواہش کرتے تو وہ اس کو آسانی سے رد نہ کرتا۔ ایسی حالت میں یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ چند اونٹوں کے لئے تو اس سے درخواست کرتے اور اصل معاملہ کو بالکل ٹال جاتے۔"

روایت کا مطالعہ کرنے سے یہ دونوں شبہے بے بنیاد ثابت ہوتے ہیں۔ ابن اسحاق ہی کی روایت میں یہ بھی ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ابرہہ سے ملنے عبدالمطلب کے ساتھ بنو بکر کے سردار یعمر بن نفاثہ اور ہذیل کے سردار خویلد بن واثلہ بھی گئے تھے۔ انھوں نے ابرہہ سے کہا کہ وہ تہامہ کا ایک تہائی مال لے لے اور خانہ کعبہ کو ڈھانے کا ارادہ ترک کرکے واپس چلا جائے، لیکن اس نے انکار کیا"[۱] خود ابن اسحاق نے اپنی سیرت[۲] میں

---

[۱] سیرت ابن ہشام اول ص ۵۲۔
[۲] ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے سیرت ابن اسحاق تحقیق کرکے شائع کی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ نقوش لاہور رسول نمبر کی گیارہویں جلد میں شامل ہے۔

عبدالمطلب کے جو اشعار نقل کئے ہیں ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عبدالمطلب نے ابرہہ کو اس کے ارادے سے باز رکھنے اور واپس کرنے کی کوشش کی تھی:

منعت ابرهة الأشعث التي حميت … من اللئام فلم تخلق لهم دارا
منعت مكة منهم، إنني رجل … ذو اثرة لم يكن في الحب غدارا
إذ قلت يا صاحب الحبشان، ان لنا … من دون أن يهدم المعمور أخطارا
فصار في جيشه بالفيل مقتدرا … وسرت مستبسلا الموت صبارا
في فتية من قريش ليس ميتهم … بمورث حيهم شينا ولو عارا[1]

[تو نے ابرہہ کو اس سرزمین سے روک دیا جو ایسے کمینوں کی دست برد سے محفوظ ہے جن کا کوئی ٹھکانہ نہیں، تو نے ان حملہ آوروں سے اہل مکہ کی حفاظت فرمائی۔ بے شک میں صاحب قبیلہ ہوں اور محبت میں غداری (بدعہدی) کرنے والا نہیں ہوں۔ جب میں نے اس سے کہا اے حبشیوں کے سردار، اگر خانۂ کعبہ منہدم ہو جائے تو ہمارے لئے اس میں خطرات ہیں۔ وہ اپنے لشکر میں ہاتھی کے ساتھ صاحب اقتدار تھا۔ اور میں صبر کے ساتھ مرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ میرے ساتھ قریش کے ایسے نوجوان تھے جو جان کی قربانی دے کر زندہ رہنے والوں کے لئے ذلت اور عار نہیں چھوڑتے]

ان اشعار سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عبدالمطلب نے ابرہہ کو باز رکھنے کی کوشش کی تھی بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے انکار کر دینے پر مقابلہ آرائی کے لئے بھی تیار ہو گئے تھے۔ لیکن نتائج ان کے سامنے تھے

---

[1] نقوش، رسول نمبر جلد ۱۱ صفحہ ۵۹

ابرہہ کے لشکر جرار سے مقابلہ ناممکن تھا۔ راستہ میں جن قبائل نے مقابلہ کی کوشش کی تھی وہ ہزیمت کھا کر قتل اور قید کر دیئے گئے تھے۔ اس لئے اہل مکہ کو بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ ابرہہ کے لشکر کا مقابلہ کرنا ان کے بس میں نہیں۔ سیرت ابن ہشام میں ہے:

"فهمت قريش وكنانة وهذيل ومن كان بذلك الحرم من سائر الناس لقتاله. ثم عرفوا أنهم لا طاقة لهم به فتركوا ذلك" [1]

[قریش، کنانہ، ہذیل اور جو لوگ اس وقت حرم میں موجود تھے انھوں نے ابرہہ سے جنگ کرنے کا ارادہ کیا۔ پھر انھیں اندازہ ہوگیا کہ ان میں لڑنے کی طاقت نہیں ہے اس لئے جنگ کا ارادہ ترک کر دیا]

اس صورت میں صرف اللہ تعالیٰ سے دعا کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخش کر لشکر ابرہہ کو تباہ وبرباد کر دیا۔

اس سے ملتی جلتی کیفیت ہمیں غزوۂ احزاب میں ملتی ہے۔ مشرکین کے عظیم لشکر سے مقابلہ کرنے کے بجائے رسول کریمؐ نے یہ بہتر خیال کیا کہ اپنے بچاؤ کے لئے خندق کھودلی جائے۔ حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ایک موقع پر رسول اللہؐ نے صحابہ سے مشورہ کیا تھا کہ کھجوروں کی پیداوار کا ایک حصہ ادا کرنے پر صلح کرلی جائے۔ لیکن صحابہ اپنی ایمانی حمیت کی بناپر تیار نہ ہوئے تھے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے تیز ہوا اور غیر مرئی فوج بھیج کر مشرکین کو واپس ہونے پر مجبور کر دیا۔

---

[1] سیرت ابن ہشام اول صفحہ ۵۵۔

(۳) تیسرا شبہ یہ ہے کہ اہل سیر کے بیان کے مطابق ابرہہ کے حملہ کے پہلے دن سے قبائل عرب اس کی فوج پر تاخت کرتے رہتے تھے۔ ذوالرمہ کہتا ہے:

وابرهة اصطادت صدور رماحنا
جهاراً وعثنون العجاجة اكدر

نحى له عمرو فشك ضلوعه
بنافذة نجلاء والخيل تضبر

[ہمارے نیزوں نے علانیہ ابرہہ کا شکار کیا اور فضا میں کثیف غبار کا ستون قائم تھا۔ عمرو نے اس کی طرف لپک کر نیزے کے کاری زخم سے اس کی پسلیاں توڑ دیں اور شہسوار ثابت قدم رہے]

پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ قریش اس قدر مرعوب ہو جائیں کہ بالکل مقابلہ نہ کریں۔"

مولانا فراہی نے ان اشعار کی تشریح میں لکھا ہے کہ ان شعروں میں صاف تصریح ہے کہ ذوالرمہ کی قوم کے ایک آدمی نے ابرہہ کو نیزہ مارا اور یہ واقعہ جس پیش آیا کثیف غبار آسمان تک بلند تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ اسی دن اللہ نے ہوا بھیج کر ان پر سنگریزوں سے بارش کی۔"[۵] اس تشریح میں مولانا سے تسامح ہو گیا ہے۔ مولانا کے نزدیک جس دن یہ یہ واقعہ پیش آیا اسی دن اللہ تعالیٰ نے سنگباری کے ذریعہ لشکر ابرہہ کو ہلاک کر دیا۔ حالانکہ صحیح یہ ہے کہ شاعر نے ان اشعار میں لشکر ابرہہ سے پہلے

---

[۵] تفسیر سورۂ فیل ص۴۸ ۔

ہونے والی جھڑپوں میں سے کسی جھڑپ کا تذکرہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ شاعر ہارنے والا ہے۔ دوسرے یہ کہ خود ان کے نزدیک یہ بات طے شدہ ہے کہ اہل مکہ نے لشکر ابرہہ سے نیزوں کے ذریعے آمنے سامنے مقابلہ کرنے کے بجائے پہاڑوں پر جاکر مقابلہ کیا تھا۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:

"اس میں شبہ نہیں کہ اس موقع پر قریش پہاڑوں پر چلے گئے تھے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ مدافعت سے کلیۃً دست بردار ہو کر پہاڑوں پر جا چھپے تھے بلکہ ابرہہ کی عظیم فوج کے مقابل میں مدافعت کی واحد ممکن شکل جو وہ اختیار کر سکتے تھے یہی تھی اس وجہ سے انھوں نے یہی اختیار کی۔۔۔۔ ابرہہ کا لشکر ساٹھ ہزار تھا اور اس کے ساتھ ہاتھیوں کا ایک دستہ بھی تھا۔ اتنی بڑی فوج کا مقابلہ میدان میں نکل کر اور صف بندی اور تلواروں کے ذریعے سے کرنا قریش کے لئے ممکن نہ تھا۔ وہ اگر اپنا پورا زور واثر استعمال کرتے تو بھی شاید دس بیس ہزار سے زیادہ آدمی اکٹھے نہ کر پاتے۔ اس وجہ سے انھوں نے اپنے لئے بہترین جنگی پالیسی یہی خیال کی کہ میدان میں نکل کر مقابلہ کرنے کے بجائے پہاڑوں میں محفوظ ہو جائیں اور وہاں سے گوریلوں کے طریقے پر جس حد تک ان کے اقدام میں مزاحمت پیدا کر سکتے ہوں، کریں۔" [1]

قریش کے مقابلہ نہ کرنے کی وجہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہونے والی جھڑپوں کے نتائج سے واقف تھے انھیں سوائے اللہ کے غیبی مدد کے کسی سہارے کی امید نہیں تھی اس لئے مقابلہ کی تیاریوں کے بجائے وہ اللہ تعالیٰ سے دعا و مناجات

---

[1] تدبر قرآن جلد ہشتم ص ۵۶۱-۶۲

اور تفریح و ابتہال کرتے ہوئے پہاڑیوں میں چلے گئے۔

(ہ) مولانا فراہی نے لکھا ہے کہ "علمائے سیر کے بیان کے مطابق ابرہہ کا حملہ موسم حج میں ہوا تھا" اور دلیل میں عکرمہ بن ہاشم کا یہ شعر نقل کیا ہے:

لاھم أخز الاسود بن مقصود الآخذ الهجمة فیھا التقلید

[خداوندا، اسود بن مقصود کو رسوا کر جو قربانی کے اونٹوں کو جن کی گردنوں میں قلادے تھے ہنکا لے گیا]

جہاں تک علمائے سیر کا تعلق ہے ان کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں کہ انھوں نے ابرہہ کے حملے کا وقت موسم حج بتایا ہے تلاش بسیار کے باوجود ہمیں ایک روایت بھی ایسی نہیں ملی جس سے موسم حج میں ابرہہ کے حملے کا اشارہ ملتا ہو، اس کا اعتراف نسیم اصلاحی صاحب نے بھی کیا ہے۔[1] تاریخ و سیر کی متداول کتابوں میں جب ایک روایت بھی ایسی نہیں ملتی جس سے موسم حج میں حملۂ ابرہہ کا پتہ چلتا ہو تو محض خوش گمانی علمی تحقیقات میں کارگر ثابت نہیں ہوسکتی۔ واقعۂ فیل کے زمانے کے بارے میں بہت سے اقوال ملتے ہیں۔ لیکن مشہور قول یہ ہے کہ اسی سال حضورؐ کی ولادت ہوئی اور اور مشہور قول کے مطابق حضورؐ کی ولادت سے پچاس دن قبل یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ نسیم اصلاحی صاحب کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ جن روایتوں میں واقعۂ فیل کا زمانہ محرم بتلایا گیا ہے ان کا ماخذ صرف محمد بن اسحاق کی بیان کردہ روایت ہے اس لئے کہ ان کے علاوہ بھی دوسرے راویوں کی تصریحات ملتی ہیں، چنانچہ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں ابوجعفر باقر سے بھی یہی خیال نقل کیا ہے کہ

---

[1] تحقیقات اسلامی شمارہ مذکور ص ۶۲۔۶۴۔

یہ واقعہ محرم کا ہے[1] اور اگر ان روایتوں کا ماخذ صرف محمد بن اسحاق ہی ہوتے تو اسے نا قابل اعتبار قرار نہیں دیا جا سکتا اس لئے کہ پچھلے گزر چکا کہ تاریخ و سیر میں تمام علماء کے نزدیک محمد بن اسحاق معتبر ہیں۔

نسیم اصلاحی صاحب نے ایک انوکھا استدلال ابن اسحاق کی روایت "وھمت قریش وکنانة ومن کان معھم بالحرم من سائر الناس" میں "من سائر الناس" کے الفاظ سے یہ کیا ہے کہ جب حج ختم ہو چکا تھا تو حرم میں پھر کون لوگ رہ گئے تھے؟ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حجاج ہی تھے[2] لیکن یہ انتہائی مہمل اعتراض ہے۔ ظاہر ہے کہ حرم کبھی لوگوں سے خالی نہیں ہوتا۔ ہمہ وقت لوگ طواف و عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ محض "من سائر الناس" کے الفاظ سے یہ استدلال کر یہ حج کا زمانہ تھا مضحکہ خیز ہے۔ مزید حیرت یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ ایک طرف نسیم صاحب اس روایت کو ابن اسحاق کی قرار دے کر نا قابل استشہاد قرار دیتے ہیں۔ دوسری جانب خود اس سے استدلال کرتے ہیں اور اس سے آگے کی عبارت "ثم عرفوا انھم لا طاقة لھم به فترکوا ذلك" چونکہ ان کے خلاف پڑتی ہے اس لئے اسے نظر انداز کر جاتے ہیں۔

مولانا فراہی کا استدلال صرف عکرمہ کے مذکورہ شعر سے ہے جبکہ اس شعر سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسود بن مقصود جو اونٹ ہنکا لے گیا تھا۔ ان کے گلوں میں قلادے تھے۔ قلادہ صرف اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ اونٹ کو قربانی کے لئے خاص کر دیا گیا ہے۔ ضروری نہیں کہ تمام اونٹوں کو ایک ہی سال قربان کر دیا جائے

---

[1] البدایہ والنہایہ دوم ص ۲۶۱-۲۶۲ دار الفکر العربی۔

[2] تحقیقات اسلامی ص ۶۴۔

تاریخ طبری میں ہمیں ابن عباس سے مروی ایک روایت ملتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ" ابرہہ نے جب عبدالمطلب کے اونٹ واپس کردیئے تو انھوں نے ان کی گردنوں میں جوتے کے قلادے پہنا کر اور ان کا شعار کر کے ہدی بنا دیا اور حرم میں منتشر کر دیا تاکہ انھیں کوئی گزند پہنچے تو رب حرم کا غضب بھڑک اٹھے"

" فأمر بردها عليه، فلما قبضها قلدها النعال وأشعرها وجعلها هديا، وبثها في الحرم لكي يصاب منها شيئ فيغضب الحرم" [1] ممکن ہے شاعر نے اسی بات کو اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہو۔

(۵) مولانا نے لکھا ہے کہ "عرب شعراء نے قبیلۂ ثقیف کی ہجو کی ہے کیونکہ انھوں نے کعبہ کی حمایت کے وقت بزدلی دکھائی۔ اہل عرب ابو رغال ثقفی کی قبر پر سنگساری کرتے رہے کیونکہ اس نے ابرہہ کی فوج کو رستہ بتایا تھا۔ اگر ثقیف کی طرح عرب بھی بھاگ گئے تھے تو ثقیف ہی کا کیا قصور تھا کہ ان کی ہجو کی گئی"

لیکن دونوں صورتوں میں بیّن فرق ہے۔ قبیلۂ ثقیف کو جب ابرہہ کی آمد کی اطلاع ملی تو اس نے اپنے بتکدے کو بچانے کے لئے اس کی خدمت میں جا کر عرض کیا کہ لات کا یہ بتکدہ وہ نہیں جسے ڈھانے کے لئے آپ آئے ہیں بلکہ وہ مکہ میں ہے۔ انھوں نے صرف راستہ بتانے پر اکتفا نہ کیا بلکہ ابو رغال نامی ایک شخص کو ان کی رہنمائی کے لئے ساتھ کر دیا۔ اس کے برخلاف اہل مکہ نے ابرہہ کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کیا۔ انھوں نے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی حتی المقدور کوشش کی۔ جب وہ نہ مانا تو چونکہ وہ اس کے دفاع کی طاقت نہ رکھتے تھے اس لئے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا۔

---

[1] تاریخ الامم والملوک جلد دوم صفحہ ۱۱۴۔

(۷) مولانا فراہی نے کید کی یہ تشریح کی ہے :

"قرآن مجید میں تصریح ہے کہ اصحاب الفیل نے ایک مخفی چال چلی تھی۔ لیکن روایات میں اس کے حملے کے جو وجوہ بیان کئے گئے ہیں ان میں مخفی چال کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ وہ اس کے برعکس قوت نمائش اور عربوں کی تذلیل کی ایک نہایت کھلی ہوئی کارروائی ہے۔ البتہ قابل اعتماد روایات سے استنباط کرنے کے بعد کید (مخفی چال) کے چند پہلو سامنے آتے ہیں۔ مثلاً :

۱۔ اس نے احترام کے مہینوں میں حملہ کیا۔ کیونکہ اس کو خیال تھا کہ عرب ان مہینوں میں جنگ وخوں ریزی سے احتراز کرتے ہیں۔

۲۔ اس نے مکہ میں .... ایسے وقت میں داخل ہونا چاہا جب تمام اہل مکہ دوسرے عربوں کے ساتھ حج کے مراسم ادا کرنے میں مشغول ہونے تھے۔

۳۔ اس نے خاص طور پر قیام منیٰ کے دنوں میں حملہ کرنا چاہا کہ عرب یا تو منیٰ میں قربانی میں مصروف ہوں گے یا سفر کے تھکے ہارے گھروں کو واپس آ رہے ہوں گے۔" [1]

کید کا ترجمہ مخفی چال کرنا محل نظر ہے۔ لغت میں اس کے ایک معنی مطلق تدبیر بھی بیان کئے گئے ہیں۔ لسان العرب میں ہے : "الکید التدبیر بباطل او حق" (کید تدبیر کو کہتے ہیں خواہ حق ہو یا ناحق) قرآن میں بھی کید کا استعمال خفیہ چال کے لئے

---

[1] تفسیر سورۂ فیل ص۱۵

[2] لسان العرب ابن منظور ۳۸۹/۴ مادۂ کید

خاص نہیں ہے بلکہ کبھی مطلق تدبیر کے معنی میں آتا ہے جیسے درج ذیل آیت میں:

"من كان يظن أن لن ينصره الله في الدنيا والآخرة فليمدد بسبب إلى السماء ثم ليقطع فلينظر هل يذهبن كيده ما يغيظ" (الحج - ۱۵)

[جو شخص گمان رکھتا ہو کہ اللہ دنیا اور آخرت میں اس کی کوئی مدد نہ کرے گا اسے چاہئے کہ ایک رسی کے ذریعے آسمان تک پہنچ کر تعلق توڑ لے پھر دیکھ لے کہ آیا اس کی تدبیر کسی ایسی چیز کو رد کر سکتی ہے جو اس کو ناگوار ہے]

... ی تدبیر کے معنی میں آتا ہے خواہ علانیہ ہی کیوں نہ ہو۔ حضرت ابراہیم کے ... ی قوم کی کھلی سازشیں ڈھکی چھپی نہ تھیں۔ انھوں نے علانیہ معبودوں کی دہائی ... حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ کے الاؤ میں جھونک دینے کا منصوبہ بنایا ... نے اس کے لئے بھی 'کید' کا لفظ استعمال کیا:

"قالوا ابنوا له بنيانا فألقوه في الجحيم، فأرادوا به كيدا فجعلناهم الأسفلين" (الصافات: ۹۷-۹۸)

"قالوا حرقوه وانصروا آلهتكم إن كنتم فاعلين، قلنا يا نار كوني بردا وسلاما على ابراهيم، وأرادوا به كيدا فجعلناهم الأخسرين" (الانبياء ـــ ۶۸-۷۰)

... کے معنی خفیہ چال کے مان بھی لیں تب بھی مولانا فراہی کی مذکورہ تشریح ... اس لئے کہ اوپر گزرا کہ ابرہہ کا حملہ موسم حج میں نہیں بلکہ محرم کے مہینے ... ابن اسحاق کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابرہہ نے تلیس نامی

گرجا گھر تیار کرایا تھا اور چاہتا تھا کہ لوگ خانہ کعبہ کا حج کرنے کے بجائے اس گرجے کا حج کریں۔ اس اثنار میں کسی عرب نے گرجا گھر کو گندا کر دیا یا ممکن ہے خود اس نے سازش کر کے گندا کروا دیا ہو اور عربوں کی جانب منسوب کر دیا ہو۔ بہرحال اس طرح اس نے ظاہر میں خانہ کعبہ کو ڈھانے کا ایک بہانہ تلاش کر لیا۔ ورنہ وہ دل میں بہرصورت اسے ڈھانے کا عزم رکھتا تھا۔ فخر الرازی نے بھی کید کی یہی تشریح کی ہے۔[۱]

کلام عرب سے استشہاد :

(۱) مولانا فراہی نے دسویں فصل کا عنوان یہ قائم کیا ہے "کلام عرب کی شہادت کہ سنگباری آسمان اور ہوا سے ہوئی" اور اس میں سات آٹھ شعرار کے اشعار نقل کئے ہیں۔ لیکن تعجب ہوتا ہے کہ بیشتر اشعار میں سنگباری کا کوئی تذکرہ نہیں جو اشعار سے کسی نہ کسی صورت استدلال کیا جا سکتا ہے وہ صرف یہ ہیں :

فأرسل من ربهم حاصب يلفهم مثل لف القزم

(ابوقیس)

فلما أجازوا بطن نعمان ردهم جنود الاله بين ساف وحاصب

(ابوقیس)

حمدت الله اذ عاينت طيرا وحصب حجارة تلقى علينا

(نفیل خثعمی)

پہلے دو اشعار میں 'حاصب' اور 'ساف' کے الفاظ ہیں۔ ان سے انھوں نے

---

[۱] تفسیر کبیر رازی ۳۲/۹۹ دار احیار التراث الاسلامی

یہ استدلال کیا ہے کہ عربی میں حاصب اس تند ہوا کو کہتے ہیں جو کنکریاں اور سنگریزے لاکر پاٹ دیتی ہے اور سافی اس ہوا کو کہتے ہیں جو گردوغبار، خس و خاشاک اور درختوں کی پتیاں اڑاتی ہوئی چلتی ہے" دوسرے شعر کا ترجمہ مترجم مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے یہ کیا ہے: جونہی وہ بطن نعمان سے آگے بڑھے خدا کی فوجوں نے ساف اور حاصب کی شکل میں نمودار ہوکر انھیں پسپا کر دیا"[۵] یہ ترجمہ صحیح نہیں خود انھوں نے اپنی تفسیر تدبر قرآن میں اس شعر کا جو ترجمہ کیا ہے وہ زیادہ صحیح ہے: "جونہی وہ بطن نعمان سے آگے بڑھے خدا کی فوجوں نے ساف اور حاصب کے درمیان نمودار ہوکر انھیں پسپا کر دیا"[۶] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی فوج جس نے لشکر ابرہہ کو پسپا کیا وہ ساف اور حاصب کے سوا کچھ اور ہے۔ ان فوجوں نے لشکر کو اس حال میں پسپا کیا جب تیز و تند ہوا چل رہی تھی۔ وہ خدائی فوج کیا تھی روایتوں سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ شعر مختلف کتابوں میں کچھ الفاظ کے اختلاف سے مذکور ہے۔ جیسے سیرت ابن ہشام میں ہے:

خشیت اللہ لما رایت طیرًا وقذف حجارۃ ترمی علینا

[میں اللہ سے ڈرا جب میں نے پرندوں کو دیکھا۔ اس وقت ہمارے اوپر پتھر پھینکے جا رہے تھے]

سیرت ابن ہشام میں ہے:

حمدت اللہ اذ ابصرت طیرا وخفت حجارۃ تلقی علینا

[میں نے اللہ کا شکر ادا کیا جب پرندوں کو دیکھا۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں پتھر ہمارے اوپر نہ آپڑیں]

---

[۵] سورۃ فیل ص ۷۴ [۶] تدبر قرآن ہشتم ص ۵۶۱

تمام اشعار نقل کرنے کے بعد مولانا فراہی نے لکھا ہے:

"ان اشعار کو غور سے پڑھو، یہ لوگ جو واقعہ کے عینی شاہد ہیں چڑیوں اور پتھروں کا ذکر ساتھ ساتھ کرتے ہیں لیکن یہ نہیں کہتے کہ یہ پتھر چڑیوں نے پھینکے بلکہ اس سنگباری کو حاصب اور ساف کا نتیجہ قرار دیتے ہیں" [1]

پہلے دو شعروں کے بارے میں وضاحت کر دی کہ شاعر نے لشکر کو پسپا کر... کی نسبت ساف اور حاصب کی طرف نہیں بلکہ "جنود الالٰہ" کی طرف کی ہے۔ تیسرے شعر میں شاعر چڑیوں اور سنگباری کا ایک ساتھ ذکر کرتا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ چڑیاں ہی سنگباری کر رہی تھیں۔ شعر کا جو انداز ہے بھی اس بات کی تائید کرتا ہے۔ مولانا فراہی نے خود لکھا ہے کہ "شعراء کا عام انداز اجمال اور کنایہ کا ہوتا ہے وہ زیادہ تصریح و تفصیل نہیں کیا کرتے" شاعر کہتا ہے میں نے چڑیوں کو دیکھا تو اللہ کا شکر ادا کیا اور اس وقت مجھے ڈر لگ رہا تھا کہیں پتھر ہمارے اوپر نہ آگریں۔ چڑیوں کو دیکھتے ہی اللہ کا شکر ادا کرنے اور اپنے اوپر پتھر گرنے کا خوف کرنے کا کیا مطلب ہوگا؟ اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ شاعر نے چڑیوں کو سنگباری کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

ایسا بھی نہیں کہ کسی شاعر نے بصراحت چڑیوں کے پتھر پھینکنے کا تذکرہ نہ کیا ہو۔ ابن ہشام نے عبداللہ بن قیس الرقیات کے جو اشعار نقل کئے ہیں ان میں بصراحت چڑیوں کی سنگباری کا تذکرہ ہے:

کادہ الأشرم الذی جاء بالفیل   فولی وجیشہ مھزوم
واستھلت علیھم الطیر بالجندل حتی کانہ مرجوم

---

[1] تفسیر سورۂ فیل صد ۶۶

ذاك من يغزه من الناس يرجع   وهو فلّ من الجيوش ذميم[1]

[اس کے خلاف (ابرہہ) اشرم نے سازش کی جو ہاتھی لے کر آیا تھا لیکن اسے منہ پھیر کر بھاگنا پڑا اور اس کا لشکر پسپا ہو گیا اور چڑیوں نے اس پر کنکریاں پھینکیں یہاں تک کہ اس کی حالت ایسی ہو گئی جیسے اس پر سنگ ساری کی گئی ہو۔ ہر اس شخص کا یہی حشر ہو گا جو خدا سے آمادۂ جنگ ہو گا۔ اسے شکست خوردہ ہو کر واپس بھاگنا پڑے گا]

یہ اشعار سیرت ابن ہشام میں موجود ہیں جو مولانا فراہی کی نظر سے ضرور گزرے ہوں گے لیکن معلوم نہیں کیوں مولانا نے انھیں لائق اعتنا نہیں سمجھا۔

(جاری)

---

[1] سیرت ابن ہشام اول ص ۶۳